بابری مسجد: بھارتی عدالت و سیاست بے نقاب

افتخار گیلانی

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کی رات، بی بی سی نے نشریات روک کر اعلان کیا: ''اتر پردیش کے شہر فیض آباد سے سنڈے آبزرور کے نمایندے قربان علی لائن پر ہیں اور وہ ابھی ابھی ایودھیا سے وہاں پہنچے ہیں''۔ اگلی پاٹ دار آواز قربان علی کی تھی۔ جس میں انھوں نے دنیا کو بتایا کہ ''مغل فرماں روا ظہیرالدین بابر کی ایما پر تعمیر کی گئی بابری مسجد اب نہیں رہی''۔ جس وقت وہ ایودھیا سے روانہ ہوئے، وہ ملبہ کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس دن کسی بھی ابلاغی ادارے کا ایودھیا میں موجود اپنے رپورٹروں سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ بھارتی حکومت دعویٰ کر رہی تھی کہ ''ایک ہجوم نے مسجد پر حملہ کر کے اس کو معمولی نقصان پہنچایا اور سکیورٹی دستوں نے ان کو پیچھے دھکیل دیا ہے''۔

ہندو نسل پرست تنظیموں بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) اور ویشوا ہندو پریشد (وی ایچ پی) نے جب رام مندر تحریک شروع کی، تو میں انھی دنوں دہلی میں صحافت کی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ بی جے پی کے مرکزی لیڈر ایل کے ایڈوانی کی 'رتھ یاترا' جب چاندنی چوک سے گزر رہی تھی، تو میں سڑک کے کنارے، ہوا میں تلواریں اور بھالے لہراتے ہجوم کو 'جے شری رام'، 'مندر وہیں بنائیں گے' اور مغل فرماں روا ظہیرالدین بابر کی اولاد کے نام لے کر گالیوں ملے نعرے بلند کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ آنجہانی پرمود مہاجن اس یاترا کے چیف آرگنائزر تھے، مگر دہلی میں بی جے پی کے دفتر میں موجودہ وزیراعظم نریندر امودی اس کے متعلق پروگرام وغیرہ کی بریفنگ دیتے تھے۔

نومبر ۲۰۱۹ء میں بھارتی سپریم کورٹ کے عجیب و غریب فیصلے کے بعد بابری مسجد ایک قصۂ پارینہ بن ہی گئی تھی۔ پھر ۳۰ ستمبر ۲۰۲۰ء کے روز مسجد مسمار کرنے والوں کو بھی اتر پردیش صوبہ کے شہر لکھنؤ کی خصوصی عدالت نے 'بے گناہ' قرار دے کر، انصاف کو دفن کرنے کا مزید سامان مہیا کر دیا۔

پچھلے ۲۸ برسوں کے دوران عدالت کے رویے کو دیکھ کر کچھ زیادہ امیدیں نہیں بندھی تھیں۔ سپریم کورٹ نے ایک طرف مسجد کی زمین ہندو بھگوان رام للا کے سپرد کی۔ دوسری طرف مسلم فریق کے تین اہم دلائل کو بھی تسلیم کر کے فیصلہ میں شامل کر دیا۔ یہ بھی تسلیم کیا کہ ''۱۹۴۹ء کو رات کے اندھیرے میں مسجد کے محراب میں بھگوان رام کی مورتی رکھنا اور پھر دسمبر ۱۹۹۲ء کو مسجد کی مسماری مجرمانہ فعل تھے''۔ پھر عدالت نے آثار قدیمہ کی تحقیق کا بھی حوالہ دے کر بتایا: ''۱۵۲۸ء میں جس وقت مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، اس وقت کی کسی عبادت گاہ کے آثار نہیں ملے۔ ہاں، کھدائی کے دوران، جو کچھ آثار پائے گئے، ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے، کہ اس جگہ پر ۱۱ویں صدی میں کوئی عمارت موجود تھی، جو تباہ ہوچکی تھی'' (یعنی اگلے ۵۰۰ برسوں تک اس جگہ پر کوئی عمارت موجود نہیں تھی)۔

فیصلے میں شامل ان دلائل سے ایک موہوم سی امید جاگ اٹھی تھی، کہ چاہے مسجد کی زمین پر ایک پرشکوہ مندر کی تعمیر شروع ہوچکی ہے، مگر اس عبادت گاہ کو مسمار کرنے والوں کو قرار واقعی سزا دے کر ایک مثال قائم کی جائے گی۔ مگر ۲ ہزار صفحات سے بھی زائد اپنے ۳۰ ستمبر ۲۰۲۰ء کے فیصلے میں خصوصی عدالت کے جج سریندر کمار یادو نے سپریم کورٹ کی ہدایت اور تمام ثبوتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے تمام ۳۲ ملزمان کو بری کر دیا۔ اس مقدمے کی کارروائی کا مَیں خود گواہ ہوں۔ استغاثہ نے جن ۳۵۱ گواہوں کی فہرست کورٹ میں دی تھی، اس میں سے تین شخص میرے قریبی رفیق تھے، جن سے مسلسل معلومات ملتی رہتی تھیں۔ نریندر مودی کی دہلی میں آمد تو ۲۰۱۴ء میں ہوئی، اس سے قبل سیکولر جماعتوں سماج وادی پارٹی اور بہوجن سماج پارٹی، جن کی سیاست کا کاروبار مسلمان ووٹوں کو سبز باغ دکھانے پر چل رہا تھا، انھوں نے بھی بابری مسجد کی مسماری کے ملزمان کے خلاف کارروائی کرنے میں کوئی دل چسپی نہیں دکھائی۔ حتیٰ کہ ایک معمولی نوٹیفکیشن تک کا اجرا نہیں کرسکیں جس سے خصوصی عدالت میں ان افراد کے خلاف مقدمہ چلایا جاسکتا۔ اور پھر خود نوٹیفکیشن میں تکنیکی خامیاں تھیں، جن کو ۲۰۱۰ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے کہنے پر دُور کیا گیا اور سبھی مقدموں کو یک جا کر کے لکھنؤ کی خصوصی عدالت میں سماعت شروع ہوئی۔

معروف فوٹو جرنلسٹ پروین جین نے نہ صرف ۶ دسمبر کے دن بابری مسجد کی مسماری کی تصاویر لیں تھیں، بلکہ اس سے کئی روز قبل ایودھیا کے نواح میں کارسیوکوں کے گروپ میں شمولیت کر کے

ریہرسہل میں حصّہ لیا، اوران سرگرمیوں کی تصویریں بھی کیمرے میں محفوظ کرلی تھیں۔ان کے اخبار دی پائینیر نے مسجد کے مسمار ہونے پران کو شائع کیا تھا۔استغاثہ نے پروین جین کو گواہ بنایا تھا۔اس دوران ان کو کس طرح ہراساں و پریشان کیا جاتا تھااورکورٹ میں حاضری کے دن ان کو وکیلوں وعدالتی اسٹاف کے اذیت ناک رویے کا کس طرح سامنا کرنا پڑتا تھا؟ یہ خودایک دردبھری داستان ہے۔

سمن آنے پر مقررہ تاریخ سے ایک روز قبل وہ دہلی سے بذریعہ ٹرین لکھنؤ کے لیے روانہ ہوتے تھے: ''دن بھر عدالت کے باہر، عدالتی ہرکارے کی آواز کا انتظار کرنے کے بعد بتایا جاتا تھا کہ آج گواہی نہیں ہوگی، کیونکہ یا تو جج موجود نہیں ہے، یا استغاثہ یا وکیل دفاع موجود نہیں ہے''۔ جین کے بقول: ''کئی برسوں تک اس طرح کی گردشوں کے بعد جب ایک دن مجھے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا، اورابھی بیان ریکارڈ ہونے ہی والا تھا، کہ ایک معمر وکیل نے کٹہرے کے پاس آکر اپنا منہ میرے کان کے پاس لاکر ماں، بہن کی گندی گالی دے کر دھمکی بھی دے ڈالی''۔اس پر جین نے بلند آواز میں جج کو متوجہ کرتے ہوئے شکایت کی، کہ ''مجھ کو بھری عدالت میں دھمکیاں دی جارہی ہیں''۔ جج نے حکم دیا کہ ''پروین کو ایک سفید کاغذ دیا جائے، تاکہ یہ اپنی شکایت تحریری طور پر دیں''۔ شکایت جج کے پاس پہنچتے ہی ، وکیل دفاع نے دلیل دی، کہ ''اب پہلے اس کیس کا فیصلہ ہونا چاہیے کہ گواہ کو کس نے گالی اور دھمکی دی؟ اس دوران کورٹ میں ہنگامہ مچ گیا اور گواہی اگلی تاریخ تک ٹل گئی اور بتایا گیا کہ ''تم اپنا وکیل مقرر کرو، کیونکہ اب پہلے تمھیں عدالت میں دھمکانے کا کیس طے ہوگا''۔

تنگ آکر جین نے یہ کیس واپس لیا اوراصل کیس، یعنی بابری مسجد کی مسماری سے متعلق اپنا بیان درج کروانے کی درخواست کی۔اس طرح کئی تاریخوں کے بعد جب گواہی درج ہوگئی تو ان کو بتایا گیا، کہ ''بس تصویریں کافی نہیں ہیں، ۶دسمبر کے دن ایودھیا میں اپنی موجودگی ثابت کرو''۔خیر کسی طرح کئی ماہ کی تگ ودو کے بعد انھوں نے ایودھیا کے ضلعی صدر مقام فیض آباد کے ایک ہوٹل سے پرانا ریکارڈ نکالا اور اپنے ادارے پائینیر کا ایک سرٹیفکیٹ بھی حاصل کیا۔مگر اب کورٹ میں ان کو بتایا گیا کہ ''یہ کاغذات بھی ناکافی ہیں''۔آخر کئی عشرے قبل کا ٹرین ٹکٹ ان کو مل گیا اور اب کئی برسوں کے بعد یہ طے ہوگیا کہ وہ اس دن واقعی ایودھیا میں تھے، مگر اب ان کو بتایا گیا کہ ''تمھاری

تصویریں قابلِ اعتبار نہیں ہیں، اس لیے ان کے نگیٹو پرنٹ کورٹ میں پیش کرنے ہوں گے''۔

اسی دوران دہلی میں پروین جین کی عدم موجودگی میں ان کے فلیٹ پر 'چوروں' نے دھاوا بول دیا اور پورے گھر کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ گھر کی جو حالت تھی، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ درانداز کس چیز کو تلاش کر رہے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ نقدی، زیورات اور دیگر قیمتی سامان غائب تھا، مگر خوش قسمتی سے تصویروں کے نگیٹو بچ گئے تھے، کیونکہ وہ انھوں نے کسی دوسری جگہ حفاظت سے رکھے ہوئے تھے۔ کورٹ میں مسجد کی شہادت کی تیاری اور باضابط ریہرسل کرنے کی تصویریں پیش کی گئیں۔ معلوم ہوا کہ دوسول انجینیر اور ایک آرکیٹیکٹ مسجد کی عمارت گرانے کے لیے کارسیوکوں کو باضابطہ ٹریننگ دے رہے تھے۔ ان سبھی کے چہرے تصویروں میں واضح تھے۔

اسی طرح میرے کشمیری پنڈت دوست سنجے کاؤ بھی ایک گواہ تھے۔ انھوں نے مسجد کی شہادت سے قبل ایک اسٹنگ آپریشن کے ذریعے انکشاف کیا تھا کہ ۶ دسمبر کو بابری مسجد کو مسمار کر دیا جائے گا۔ ان دنوں خفیہ کیمرہ سے اسٹنگ کا رواج نہیں تھا۔ اخبار اسٹیٹسمین کے دفتر سے رات گئے جب وہ آفس کی گاڑی میں گھر جا رہے تھے، تو ڈرائیور نے ان کو بتایا کہ ایودھیا میں اس بار کچھ بڑا ہونے جا رہا ہے۔ ایڈیٹر نے اگلے دن ان کو ایودھیا جانے کی اجازت دے دی۔

مگر کاؤ نے صحافی کے بجائے ایک کارسیوک کے طور پر جانے کی ٹھانی اور دہلی میں بی جے پی کے دفتر میں سنجے کول کے نام سے اندراج کروا کے کارسیوک کا کارڈ حاصل کیا۔ ہندو اور کشمیری پنڈت ہونے کے باوجود نہ صرف ٹرین میں بلکہ فیض آباد میں بھی کئی بار ان کی پوچھ گچھ کی گئی۔ ''شاید میں نیا چہرہ تھا، وہ بار بار شک کی نگاہ سے مجھے دیکھتے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو ایک انجینیرنگ اسٹوڈنٹ بتایا، جس کو کشمیر میں حالات کی خرابی کی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی ہے''۔ ایودھیا پہنچنے پر ایک بار پھر ۶، ۷ افراد نے باقاعدہ تفتیش کی۔ کشمیری پنڈت ہونے کی دہائی دے کر آخر کار مجھ کو کارسیوکوں کے ایک گروپ میں شامل کر کے خیمہ میں رہنے کے لیے کہا گیا۔ واکی ٹاکی ہاتھ میں لیے ایک سادھو اس گروپ کا سربراہ تھا، جس نے اگلے دن ایک قبرستان میں لے جا کر ہم کو قبریں منہدم کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ بار بار ان کو تاکید کر رہا تھا کہ ہاتھ چلانا سیکھو۔ کارسیوک آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ اسی طرح مسجد کو بھی توڑنا ہے''۔ سادھو نے سنجے کاؤ کو خبردار

کیا تھا کہ ''صحافی یا خفیہ محکمہ کا کوئی فرد ان کے آس پاس نہ پھٹکنے پائے ۔ بار بار کے انٹروگیشن، ریہرسل اور صحافیوں کے بارے کارسیوکوں کے رویے نے کاؤ کو کافی ڈرا دیا۔ رات کے اندھیرے میں وہ خیمہ سے بھاگ کر پہلے فیض آباد اور پھر دہلی روانہ ہوگیا، جہاں اس نے اسٹیٹسمین میں کئی قسطوں میں چھپی رپورٹوں میں بتایا کہ مسجد کی مسماری کی تیاریاں پوری طرح مکمل ہیں۔

دنیا کو مسجد کی شہادت کی خبر دینے والے صحافی قربان علی کے مطابق شام چھے بجے تک تاریخی شاہی مسجد کو ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ وہ بی بی سی کے جنوبی ایشیا کے بیورو چیف مارک ٹیلی کے ساتھ کئی روز سے ایودھیا میں مقیم تھے۔ ان کا کہنا ہے، اگرچہ افواہوں کا بازار گرم تھا، مگر مسجد کی مسماری کا اندازہ نہیں تھا۔ بھارتی وقت کے مطابق ۱۱:۳۰ بجے صبح کارسیوکوں نے مسجد پر دھاوا بول دیا، جب کہ ایک گروپ صحافیوں کو ڈھونڈ کر ان کو پیٹ پیٹ کر کمروں میں بند کر رہا تھا۔ مارک ٹیلی اور علی ان کو غچہ دے کر کسی طرح ایودھیا سے نکل کر فیض آباد پہنچے، اور وہاں کے ٹیلیگراف آفس سے دہلی خبر بھیجی۔ اس وقت فیض آباد میں مقیم سینٹرل ریزور پولیس فورس کے دستوں نے ایودھیا کی طرف مارچ کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہی آخری خبر تھی، جو دہلی تک پہنچ سکی تھی۔ واپسی پر ان دونوں صحافیوں نے دیکھا کہ سینٹرل فورس کو ایودھیا کے باہر ہی روک لیا گیا ہے۔

خیر وہ دوسرے راستے سے ایودھیا شہر میں داخل ہوئے اور ایک ہجوم نے مارک ٹیلی کو پہچان کر ان دونوں کو ایک بوسیدہ مندر کے کمرے میں بند کر دیا۔ ''وہ پہلے ہمارے قتل کے لیے آپس میں مشورہ کر رہے تھے۔ پھر ان کے سربراہ نے ان کو بتایا کہ پہلے مسجد کے قضیہ سے نپٹ لیں، یعنی پوری طرح مسمار ہو، پھر ان کی تقدیر کا فیصلہ کریں گے''۔ شام کو کسی دوسرے گروپ نے تالا کھولا اور ان کو وی ایچ پی کے سربراہ اشوک سنگھل کے دربار میں پیش کیا، جو قربان علی اور مارک ٹیلی سے واقف تھے۔ انھوں نے ان کو رہا کرا دیا۔ مگر شہر سے جانا ابھی تک جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ قربان علی کا کہنا ہے کہ ایودھیا سے فیض آباد کی محض ۱۰ کلومیٹر کی دُوری، اس دن کئی سو کلومیٹر کا فاصلہ لگ رہا تھا اور جب وہ فیض آباد کے ہوٹل میں داخل ہو رہے تھے تو اس وقت بی بی سی اردو کی رات کی نشریات جاری تھیں، جس نے ان سے فون پر بات کر کے دنیا تک خبر پہنچائی۔

معروف قانون دان اور مصنف اے جی نورانی نے اپنی کتاب Destruction of Babri

Masjid: A National Dishonour کی تیسری جلد میں بابری مسجد کو شہید کرنے کی سازش پر خوب بحث کی ہے۔ ان کے بقول: ''مسجد کی شہادت میں بھارتی عدلیہ اور انتظامیہ نے بھرپور کردار ادا کر کے اپنی فرقہ وارانہ ذہنیت کا پول کھول دیا ہے۔ نہ صرف نچلی عدالتوں کے لیت ولعل سے بلکہ اس وقت کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس، جسٹس وینکٹ چلیا کے طریق کار نے بھی مسجد کی مسماری کی راہ ہموار کردی''۔ نورانی صاحب نے انکشاف کیا کہ ''جسٹس چلیا مسجد کو بچانے اور آئین اور قانون کی عمل داری کو یقینی بنانے کے بجائے کارسیوکوں کی صحت سے متعلق فکرمند تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ۱۹۹۸ء میں بی جے پی کی قیادت والی مخلوط حکومت کے قیام کے بعد ان کو شاید انھی خدمات کے بدلے ایک اعلیٰ اختیاری کمیشن کا سربراہ مقرر کیا گیا''۔

نورانی صاحب لکھتے ہیں: ''سابق سیکرٹری داخلہ مادھو گوڈبولے کے مطابق ان کو بھی مسجد کی شہادت کی تیاری کی اطلاع تھی۔ اسی لیے ان کے محکمے نے ریاست اتر پردیش میں مرکزی راج نافذ کرنے کا مشورہ دیا تھا، مگر کانگریسی وزیراعظم نرسمہاراؤ نے اس کو نامنظور کر دیا''۔ نورانی کا کہنا ہے کہ ''راؤ خود، مسجد کی شہادت میں بلاواسطہ ملوث تھے۔ کانگریس کے اندرا گاندھی کے دورِاقتدار میں ہی بابری مسجد کی جگہ پر رام مندر کی تعمیر کی راہ ہموار کرنے کے لیے ویشوا ہندو پریشد کے ساتھ ایک معاملہ فہمی ہوئی تھی۔

بلاشبہہ پریشد نے اندرا گاندھی کی ہلاکت کے بعد اپنی تحریک روک دی مگر راجیو گاندھی نے اس معاملہ فہمی کو پھر زندہ کیا۔ تاہم، اس سے پہلے وہ مسلمانوں پر کوئی احسان کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے ان کے حواریوں نے ایک مسلم مطلقہ خاتون شاہ بانو کا قضیہ کھڑا کیا اور پارلیمنٹ سے ایک قانون پاس کروایا کہ مسلم پرسنل لا میں عدالت کوئی ترمیم نہیں کرسکتی''۔ مصنف نے راجیو گاندھی کو مشورہ دیا تھا کہ اس قضیے کو اینگلو محمڈن قانون کے بجائے شرعی قانون کے مطابق حل کیا جاسکتا ہے، مگر وہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر بے وقوف بنا کر پریشد کے ساتھ ڈیل کو آگے بڑھا رہے تھے۔

بابری مسجد کی شہادت میں سیکولر جماعتوں کے دامن بھی خون سے آلودہ ہیں۔ بابری مسجد نے شہادت کے بعد ان سبھی چہروں سے نقاب اتار کر پھینک دیے ہیں اور اگر ابھی تک کسی کو یہ چہرے اصل رُوپ میں نظر نہ آتے ہوں، تو یقیناً ان کی دماغی حالت پر شبہے کے علاوہ اور کیا ہی کیا جاسکتا ہے!